گردشِ جام

عدم

شہناز پبلشنگ ہاؤس دہلی

قیمت دو روپیہ چار آنہ

تعداد ایک ہزار

پرنٹر کمال پرنٹنگ پریس دہلی

پبلشر شہناز پبلشنگ ہاؤس دہلی

ترتیب

غزل	۹
گیت	۸۱
قطعہ	۹۹
اشعار	۱۲۳

تبسم کی سزا کتنی کڑی ہے
گُلوں کو کھِل کے مرجھانا پڑا ہے

بڑی حسین روایات سے تعلق ہے
سبُو سے، مے سے، خرابات سے تعلق ہے
حضور دخل کوئی بے سبب نہیں دیتا
حضور میرا ہر اک بات سے تعلق ہے
شکستِ توبہ کی ضد ہے تو کھول دو گیسو!
شکستِ توبہ کا برسات سے تعلق ہے
دیارِ ہوش میں ہو یا حریمِ مستی میں
ہمیں تو اُن کی مُلاقات سے تعلق ہے
یہ ناز ہے کہ تری آرزو میں جیتے ہیں
یہ فخر ہے کہ تری ذات سے تعلق ہے
تعلقات کی غارت گری کا حال نہ پوچھ
کہ دن کے نور کا بھی رات سے تعلق ہے
عدمؔ حیات کی ہر قیمتی مسرت کا
خیال سے نہیں جذبات سے تعلق ہے

ترے جمال میں کھو کر کہاں نگاہ ملی
نہ اپنا کھوج ملا اور نہ تیری راہ ملی

تمام عمر کے ارمان ہو گئے پورے
کچھ اس تپاک سے وہ یگانہ نگاہ ملی

ہوئی وہ زلف پریشاں جو جسم سیمیں پر
کنارِ ماہ میں غلطاں شبِ سیاہ ملی

مرا جنوں تری آنکھوں سے کچھ ہوا رسوا
تری خبر مری مستی سے گاہ گاہ ملی

جہاں جہاں سے عدم وہ حسین گذرا تھا
وہاں وہاں مرے سجدوں کی بارگاہ ملی

اُن کی آنکھیں جواں ہوتی ہیں
داستانیں بیان ہوتی ہیں

جن نگاہوں میں کچھ مُرّوت ہو
دیر سے مہربان ہوتی ہیں

زندگی کی ضدیں ہی گھٹ بڑھ کے
زندگی کا زیاں ہوتی ہیں

کر رہے ہیں وہ غفلتیں ایسی
جو مُرّوت کی جان ہوتی ہیں

یوں بکھرتی ہیں کاکلیں اُن کی
جیسے راتیں جوان ہوتی ہیں

اے عدمؔ چاند سی بھویں اُن کی
وقتِ جنبش کمان ہوتی ہیں

باتیں تو سُن رہا تھا مگر یوں خموش تھا
جیسے مرا کلام اُسے بارِ گوش تھا

نغمے کی گونج، پھول کا رس، مے کی چاندنی
جس کے یہ نام ہیں، وہ جوانی کا جوش تھا

یوں بات ہو رہی تھی نگاہوں کے درمیاں
جیسے کہ ایک نطق کا دریا خموش تھا

ساقی نہ پوچھ کس طرح پہنچے ترے حضور
رستے میں اک طویل بیابانِ ہوش تھا

نادان عقل ہوش کے کانٹے خرید لائی
حالانکہ طفلِ عشق تبسم فروش تھا

تھا کچھ نہ کچھ ضرورِ عدم یہ نہیں خبر
تھوڑی سی بیخودی تھی کہ تھوڑا سا ہوش تھا

بے کلی میں قرار سا کیوں ہے — حادثہ خوشگوار سا کیوں ہے

اُن کو ضد ہے کہ ہم غریبوں کو — دِل پہ کچھ اختیار سا کیوں ہے

یوں تو ثابت ہے دامنِ ہستی — یہ مگر تار تار سا کیوں ہے

زندگی کی ہر ایک تلخی سے — جینے والوں کو پیار سا کیوں ہے

آپ اگر معتبر نہیں اِتنے — آپ پر اعتبار سا کیوں ہے

کچھ تو فرماؤ اے نظر والو — حسن ناپائیدار سا کیوں ہے

آپ کی پاکباز آنکھوں میں — ہلکا ہلکا خمار سا کیوں ہے

بکھری بکھری دراز زُلفوں کا — رنگ ابرِ بہار سا کیوں ہے

کس ستارہ مزاج سے پوچھیں — دل کا عالم شرار سا کیوں ہے

اے عدمؔ کیا ہوا طبیعت کو
آج دل کو قرار سا کیوں ہے

محبت بڑی شعبدہ کار ہے
تری چشمِ میگوں بھی بیمار ہے

ٹھہرنا مناسب نہیں راہ میں
زمانہ بڑا تیز رفتار ہے

نظر دامِ خوش رنگ میں جا پھنسی
مجھے وہم تھا گیسوئے یار ہے

مجھے کیا خبر تھی مرے چارہ گر
کہ چارہ گری بھی ایک آزار ہے

خرابات میں بھی ہیں رہزن بہت
یہ رستہ بھی تھوڑا سا دشوار ہے

سنبھل جاؤ سرکار گر جاؤ گے
پلٹ آؤ سرکار بازار ہے

عادم آدمی کی حقیقت نہ پوچھ
نہ سویا ہوا ہے نہ بیدار ہے

جب گردشوں میں جام تھے
کتنے حسین ایّام تھے

ہم ہی نہ تھے رُسوا فقط!
وہ آپ بھی بدنام تھے

کہتے ہیں کچھ عرصہ ہوا
کعبے میں بھی اصنام تھے

انجام کی کیا سوچتے
ناواقفِ انجام تھے

عہدِ جوانی میں عدمؔ
سب لوگ گُل اندام تھے

زلفِ برہم سنبھال کر چلیئے!
راستہ دیکھ بھال کر چلیئے

کچھ نہ دیں گے تو کیا زیاں ہوگا
حرج کیا ہے سوال کر چلیئے
شمع پر گر رہے ہیں پروانے
آؤ شرحِ وصال کر چلیئے
میکدے میں نہ بیٹھیے تاہم
کچھ طبیعت بحال کر چلیئے!
موسمِ گُل ہے اپنی بانہوں کو
میری بانہوں میں ڈال کر چلیئے

زندگی کا عدم یہ مطلب ہے
زندگی پائمال کر چلیئے!

کہاں سے چل کے اے ساقی کہاں تک بات پہنچی ہے
تری آنکھوں سے عمرِ جاوداں تک بات پہنچی ہے

چلی ہے جب بھی دنیا کے مظالم کی شکایت سے
تو اکثر التفاتِ دوستاں تک بات پہنچی ہے

ابھی سے کس لئے رنگ اُڑ رہا ہے اُن کے چہرے کا
ابھی تو خیریت سے درمیاں تک بات پہنچی ہے

کہیں جب بھی کوئی ناگاہ صدمہ پیش آیا ہے
تو تفریحاً نصیبِ دشمناں تک بات پہنچی ہے

مبادا بات بڑھ کر باعثِ تکلیف ہو جائے
وہیں پر ختم کر دیجے جہاں تک بات پہنچی ہے

ابھی تو اس کی آنکھوں نے لیا ہے جائزہ دل کا
ابھی تو ابتدائے داستاں تک بات پہنچی ہے

عدمؔ جھگڑا قیامت تک گیا ہے جرمِ ہستی کا
ذرا سی بات تھی لیکن کہاں تک بات پہنچی ہے

اب شدتِ غم میں مصنوعی آرام سہارا دیتا ہے
یا دوست تسلی دیتے ہیں یا جام سہارا دیتا ہے

اے دوست محبت کے صدقے تنہا ہی اُٹھانے پڑتے ہیں
رہبر تو فقط اس رستے میں دو گام سہارا دیتا ہے

بیتابیٔ دِل کی کیفیت اس حال تک اب آ پہنچی ہے
جس حال میں ہر مایوسی کو انجام سہارا دیتا ہے

دو نام ہیں صرف اس دنیا میں اک ساقی کا اک یزداں کا
اِک نام پریشاں کرتا ہے اک نام سہارا دیتا ہے

طُوفان کے تیور تو دیکھو ساحل کی کوئی اُمید نہیں
ملاح کی صورت تو دیکھو ناکام سہارا دیتا ہے

ہم کو بھی عدم کچھ قائل سا کیا لطف ہی اس بدمستی میں
کیا آگ سکوں پہنچاتی ہے کیا جام سہارا دیتا ہے

درد کی واردات ہے پیارے
داستانِ حیات ہے پیارے
تیری آنکھوں کا بھی بھروسہ کیا
عالمِ حادثات ہے پیارے
کون اِس سلسلے کو ختم کرے
تیری زُلفوں کی بات ہے پیارے
مستقل موت کی تمنّا ہے
آرزوئے حیات ہے پیارے
صبحِ محشر بھی آ ہی جائے گی
رات کٹنے کی بات ہے پیارے

سنو سنو کہ کہانی بڑی شگفتہ ہے
حدیثِ خوابِ جوانی بڑی شگفتہ ہے

بس اک مقام ہے ایسا جہانِ محزوں میں
جہاں ہوا کی روانی بڑی شگفتہ ہے

جوانیاں تو بہت سی نظر سے گزری ہیں
مگر تمہاری جوانی بڑی شگفتہ ہے

وہ گر رہے ہیں پتنگے چراغ کی لو پر
بہارِ سجدۂ فانی بڑی شگفتہ ہے

حسین بھی ہیں آنکھڑیوں میں عدمؔ
ہماری سادہ بیانی بڑی شگفتہ ہے

دل کو دل سے کام رہے گا
دو جانب آرام رہے گا
تم پر بھی آئے گی تہمت
ہم پر بھی الزام رہے گا
صبح کا تارا پوچھ رہا ہے
کب تک دَورِ جام رہے گا
بد نامی سے کیوں ڈرتے ہو
باقی کِس کا نام رہے گا
زُلفوں کی ترتیب سلامت
عالم زیرِ دام رہے گا
ہم کو عدمؔ جو ترسائے گا
وہ بھی تِشنہ کام رہے گا

غمِ ہستی کی رات جاتی ہے
تیری زُلفوں کی بات جاتی ہے

تیرا دامن چھُٹا ہے ہاتھوں سے
یا مری کائنات جاتی ہے

کِس خرابات کی ہوا کھا نے
صُبح آتی ہے رات جاتی ہے

اس طرح کب یہ زخم بھرتا ہے
جان لیکر حیات جاتی ہے

ہم اگر ہوش میں عدمؔ آئیں
چشمِ ساقی کی بات جاتی ہے

سفر طویل ہے کچھ زادِ راہ لے جاؤ
کسی فقیر کی کارِ نگاہ لے جاؤ

رہِ حیات میں گرمی بلا کی پڑتی ہے
کہیں سے سایۂ زلفِ سیاہ لے جاؤ

مبادا داورِ محشر تمہیں نہ پہچانے
ہمیں بطورِ ثبوت و گواہ لے جاؤ

اسی سے حال سمجھ لیں گے وہ غریبوں کا
بس ایک ریزہ قلبِ تباہ لے جاؤ

عدمؔ بہشت میں رونق بھی چاہتے ہو اگر
تو پھر وہاں بھی کوئی جلوہ گاہ بیچاؤ

کہہ رہے تھے جو تیرے افسانے
وہ کہاں کھو گئے خدا جانے

ناخدا خود بھی کچھ سمجھ نہ سکا
ناؤ سے کیا کہا تھا دریا نے

اس تبسم فروش دنیا نے
ہم غریبوں کو کون پہچانے

ہے یہی شکل اگر حقیقت کی
تو بڑے قیمتی ہیں افسانے

شمع کو کون اب عدمؔ پوچھے
جل چکے ہیں تمام پروانے

وقت کی کوئی بات کرو
زُلف بکھیرو رات کرو

ہونٹ ہیں یا نایاب صدف
کرنوں کی برسات کرو

آج بڑا مغموم ہے دل
یارو کوئی بات کرو

مر جائیں گے لوگ حضور
ردِّ تکلیفات کرو

لوگ بڑے ظالم ہیں عدمؔ
یونہی بسر اوقات کرو

خرابات سے جب کنارا کرو

مرا جام بھی پارا پارا کرو

چلو زہر کا جام ہی بخش دو

کوئی اِلتجا تو گوارا کرو

پریشانیوں میں بڑا حسن ہے

سیہ کاکلیں مت سنوارا کرو

مری آرزو ہے کہ غیروں کو بھی

مرا نام لے کر پکارا کرو

کسی کو سمجھنے نہ دو کوئی بات

ہمیشہ نیا روپ دھارا کرو

چھپانا بڑے عیب کی بات ہے

عدم جو کرو آشکارا کرو

شباب کی پُر خلوص نادانیوں کا موسم نکل چکا ہے
طبیعتیں بجھ چکی ہیں جولانیوں کا موسم نکل چکا ہے

ارے ارے مشکلوں کے لمحوں میں مرے نزدیک آنیوالو
مجھے یہ افسوس ہے کہ آسانیوں کا موسم نکل چکا ہے

بکھر رہی ہیں وہ عنبریں الجھنیں خیالوں میں از سرِ نو
مجھے گمان تھا مری پریشانیوں کا موسم نکل چکا ہے

ہزار شکلوں میں بھی اب آؤ تو لوگ پہچان لیں گے تمکو
مشاہدے کی حسین حیرانیوں کا موسم نکل چکا ہے

عدمؔ اُٹھو بھی کہ رونقیں ہیں شباب پر بزم میکدہ کی
تمہارے سر کی قسم پشیمانیوں کا موسم نکل چکا ہے

کتنی دِلفریب ہے، کتنی بے مثال ہے
زندگی بھی آپ کے گیسوؤں کا جال ہے
کس اُمید پر یہاں جُرمِ زیست کیجئے
دوستوں کا قحط ہے، دُشمنوں کا کال ہے
میں اَپنی رائے کا اِنکشاف کر چکا
اُن سے بھی تو پوچھئے اُن کا کیا خیال ہے
ترکِ مے کا اِذن تو بے محل نہیں مگر
یہ بھی دیکھ لیجئے عہدِ برشگال ہے
بجھ نہ جائے اے عدمؔ آج شمعِ زندگی
شب بہت طویل ہے جی بہت نڈھال ہے

خمارِ زُلف پریشاں تلاش کرتا ہوں
بڑے حسین شبستاں تلاش کرتا ہوں

ہے اِنتہائے تکلّف کہ موسمِ گُل میں
ثبوتِ جیب و گریباں تلاش کرتا ہوں

کہو کسی سے زمانہ کو روک دے پل بھر
عِلاجِ گردشِ دوراں تلاش کرتا ہوں

تلاش اور مقام تلاش کیا کہنے
چمن میں گیسوئے جاناں تلاش کرتا ہوں

جہاں چراغِ فسردہ بھی بالِ عنقا ہے
وہاں چراغِ فروزاں تلاش کرتا ہوں

تلاش کرتا ہوں جس کو بھی میں محبت سے
اسے بہ حدِ رگِ جاں تلاش کرتا ہوں

ابھی خدا کی ضرورت نہیں عدم مجھ کو
ابھی تو میں کوئی اِنساں تلاش کرتا ہوں

لاؤں کہاں سے ڈھونڈھ کے اے قلبِ نامراد
تسکینِ اضطراب کی صورت کہیں جسے

اے دوست میرے سینہ کی دھڑکن تو دیکھنا
وہ چیز تو نہیں ہے محبت کہیں جسے

اے جانِ عشق تیرے تغافل کی خیر ہو
اِک اور چیز بھی ہے مروّت کہیں جسے

مضطر بس ایک زخم کی حسرت ہے روح کو
نغمہ کہیں کہ ہوشِ سماعت کہیں جسے

سمٹی تو تشنگیِ دہنِ یار بن گئی
وہ چیز کائنات کی وسعت کہیں جسے

دینے لگے ہیں پھر وہ فریبِ نظر عدمؔ
پھر دل کو پڑ گئی ہے ضرورت کہیں جسے

خوش ہوں کہ زندگی نے کوئی کام کر دیا
مجھ کو سپردِ گردشِ ایام کر دیا

ساقی سیاہ خانۂ ہستی میں دیکھنا
روشن چراغ کس نے سرِ شام کر دیا

پہلے مرے خلوص کو دیتے رہے فریب
آخر مرے خلوص کو بدنام کر دیا

کتنی دعائیں دوں تری زلفِ دراز کو
کتنا وسیع سلسلۂ دام کر دیا

وہ چشمِ مست کتنی خبردار تھی عدمؔ
خود ہوش میں رہی، ہمیں بدنام کر دیا

خرد فسانہ و تمثیل و خواب ہے ساقی
جنوں ہوائے شبِ ماہتاب ہے ساقی

ہے میکدہ وہ خلاصہ رموزِ دانش کا
جہانِ حقیقت دریا حباب ہے ساقی

بچا بچا کہ متاعِ نظر ہے خطرے میں
جگا جگا کہ خرد محوِ خواب ہے ساقی

سمجھ گیا ہوں میں تیری نگاہ کا مطلب
نظر ہی رنگ نظر ہی شراب ہے ساقی

بکھیر گیسوئے مشکیں کہ قصدِ سجدہ ہے
اُٹھا پیالہ کہ عزمِ خطاب ہے ساقی

انہیں بھی چوٹ لگی ہے تری مروّت کی
گلوں کا رنگ بھی رنگِ شراب ہے ساقی

عدم سے روشنی لیتے ہیں اہلِ عقل و خرد
یہ رندِ مست نظر آفتاب ہے ساقی

جام جب گُل فروش ہوتا ہے
کِس کو توبہ کا ہوش ہوتا ہے
سطح کے شور سے نہ گھبراؤ
قعرِ دریا خموش ہوتا ہے
جتنی ہشیار ہیں تری آنکھیں
اِس قدر کِس کو ہوش ہوتا ہے
جو نیا دن طلوع ہوتا ہے
قصۂ خواب دوش ہوتا ہے
پہلی پہلی محبّتوں میں عدمؔ
کِتنا جوش و خروش ہوتا ہے

آپ معشوق ہیں نبی تو نہیں!
عشق ایک فرض منصبی تو نہیں

خواہشیں بے ریا بھی ہوتی ہیں
ہر غرض مند مطلبی تو نہیں

اُن کی زُلفوں سے فیصلہ لیلو
عشق آزاد مشربی تو نہیں

پھُول کیوں چاہتے ہیں شبنم کو
دوستی ربطِ یک شبی تو نہیں

جس کو کہتے ہیں لوگ خود بینی
وہ عدم درسِ مکتبی تو نہیں

آدمی کی جگہ خدا ہوگا
وعدۂ حشر کیا وفا ہوگا

تھا کسی کا تو بوجھ کشتی پر
میں نہیں تھا تو ناخدا ہوگا

لوگ کل کس کا ذکر کرتے تھے
آپ نے بھی تو کچھ سنا ہوگا

رات کٹنے کے منتظر ہو عدمؔ
رات کٹ بھی گئی تو کیا ہوگا

اُن کو خوئے وفا نہ ہو جائے
ظُلم کی انتہا نہ ہو جائے

عزم توبہ تو کر رہا ہوں میں
تیری رحمت خفا نہ ہو جائے

ہم کو بھی دے رہے ہو ساغرِ مے
خونِ ارض و سما نہ ہو جائے

ادھری سمت دیکھنے والے
تو مرا مدعا نہ ہو جائے

ڈوبنے سے تو احتراز نہیں
شہرت ناخدا نہ ہو جائے

آدمیت عدم گناہ نہیں
اس سے کہدو خدا نہ ہو جائے

گرچہ گردش میں صبح و شام رہے
کام دُنیا کے نا تمام رہے

آہ اُن گیسوؤں کی شادابی
اہلِ دانش بھی زیرِ دام رہے

ہم کو منزل کا اتنا فکر نہ تھا
ہم بہر حال سُست گام رہے

جو سعادت ہے آپ لے جائیں
جو خرابی ہے میرے نام رہے

حادثہ ہے کہ چند دن ہم بھی
اتفاقاً فلک مقام رہے

کیا ملے گا عدم ستاروں سے
کون گردش میں صبح و شام رہے

اندازِ مروّت خوب رہا، اندازِ تغافل خُوب رہا
کچھ اُن کے کرم مرغوب رہے کچھ اِن کا ستم محبُوب رہا

کشتی تو بھنور میں ڈوب گئی غم یہ ہے کہ ساحل والوں نے
اتنا بھی نہ چھوٹے منہ سے کہا نا خوب رہا یا خوب رہا

ہم وضع پہ مٹنے والوں کا کیا کام بدلتی دنیا سے
جو بھیس ہمیں مرغوب ہوا، وہ بھیس ہمیں مرغوب رہا

دونوں کو نگاہِ جاناں نے توقیر برابر کی بخشی
تا عمر خرد برباد رہی تا عمر جنوں منسُوب رہا

افسوس ہے اُن کی محفل میں کیوں رات عدمؔ ہم جا نکلے
محفل بھی بہت خاموش رہی ساقی بھی بہت محجُوب رہا

ہم ان کا بھرم بھی کھو بیٹھے کیا پاپ ہوا کیا بھول ہوئی
یاروں کی مرادیں بر آئیں، غیروں کی دعا مقبول ہوئی

معلوم نہیں ہم اس ساعت کس سوچ میں غلطاں بیٹھے تھے
جب ان کا کرم مایوس گیا جب ان کی نظر مبذول ہوئی

آغازِ محبت کا قصہ کچھ اتنا تعجب خیز نہیں
کچھ میری نظر سے بھول ہوئی کچھ انکی نظر سے بھول ہوئی

اب ذکر نہ چھیڑو لاحاصل گذرے ہوئے غم کی تلخی کا
جو ظلم ہوا وہ ٹھیک ہوا جو بات ہوئی معقول ہوئی

جب تک نہ ملی تھی ان سے نظر ہم ہوش میں تھے تھوڑے سے علم
پھر اپنی خبر کیا آئی تھی جب ان کی خبر موصول ہوئی

کہیے سرکار کیا ارادہ ہے

درِ خرابات کا کشادہ ہے

مسئلہ زندگی کا اے ساقی

کتنا پر پیچ اور سادہ ہے

کاش وہ کاکلیں بکھر جائیں

آج گرمی بہت زیادہ ہے

دیکھئے تو وہ بال پھیلائے

راہ میں کون ایستادہ ہے

اے عدمؔ گلّوں کی محفل میں

ذکرِ یار اور حدیثِ بادہ ہے

جنوں کا رنگ بڑا پائیدار ہوتا ہے
وہ جب بھی آتے ہیں عہدِ بہار ہوتا ہے

کلی کو یہ نہیں شاید کسی نے سمجھایا
کہ پھول کھل کے بہت شرمسار ہوتا ہے

وہ جس کے زور پہ چلتے ہیں کاروبارِ حیات
عجیب سلسلۂ اعتبار ہوتا ہے

نہ چھیڑ تذکرۂ ابر مے کشی کے لئے
ہمارے ساتھ ہی ابرِ بہار ہوتا ہے

بڑھاؤ ربط نہ ان بے نیاز بندوں سے
کہ جو حسین ہے فراموش گار ہوتا ہے

مرے ندیم! گریباں کی احتیاط نہ کر
کہ اس سے اور بھی یہ تار تار ہوتا ہے

عدم عجیب گھڑی ہے وہ بے قراری کی
کسی حسین کا جب انتظار ہوتا ہے

غموں کی رات بڑی بیکلی سے گزری ہے

گزر گئی ہے مگر جاں کنی سے گزری ہے

مسیحؑ و خضرؑ کی عمریں نثار ہوں اُس پہ

وہ زندگی کی گھڑی جو خوشی سے گزری ہے

ہم آشنا ہیں قیامت کی دلفریبی سے

ہزار بار تمہاری گلی سے گزری ہے

خزاں تو خیر خزاں ہے ہمارے گلشن سے

بہار بھی بڑی آزردگی سے گزری ہے

گزر تو خیر گئی ہے عدم حیات مگر

ستم ظریف بڑی بے رخی سے گزری ہے

بزم کی بزم چُور ہے ساقی — بات کوئی ضرور ہے ساقی

تیری آنکھوں کو کر دیا سجدہ — میرا پہلا قصور ہے ساقی

پوچھ لے اپنی زلفِ برہم سے — ہر اندھیرے میں نور ہے ساقی

دل کبھی مطمئن نہیں ہوتا — آگہی کا فتور ہے ساقی

تیری آنکھیں کسی کو کیا دیں گی — اپنا اپنا سرور ہے ساقی

پھول ہیں، مے ہیں، اور نغمے ہیں — کچھ تعلق ضرور ہے ساقی

پینے والوں کو بھی نہیں معلوم — مے کدہ کتنی دور ہے ساقی

تیری توقیر گھٹ نہیں سکتی — تو ہمارا غرور ہے ساقی

زندگی کے ستم کا خمیازہ — زندگی کا شعور ہے ساقی

میرا مذہب شراب خانہ ہے — میرا مسلک سرور ہے ساقی

ہر نشیلی اُمنگ کا مطلب — سرخیِ چشمِ حور ہے ساقی

عقل بے ربطیٔ مقاصد ہے — عشق حسنِ امور ہے ساقی

حرفِ کاوش نہیں عدم یونہی
شعر بھی اِک سرور ہے ساقی

جبینوں کے گرم مہینوں کی خیر ہوتی ہے
شراب رنگ پسینوں کی خیر ہو ساقی

جوانیوں کے گلابی بھنور ہیں گردش میں
دلوں کے نرم سفینوں کی خیر ہو ساقی

بڑے خلوص سے کرتے ہیں رہزنی ظالم
حرم کے راہ نشینوں کی خیر ہو ساقی

دلِ تباہ میں آبادیاں ہیں یاروں کی
مکاں کی خیر مکینوں کی خیر ہو ساقی

یہ کشتیاں ہیں کہ بہتے ہوئے نگینے ہیں
سبک خرام نگینوں کی خیر ہو ساقی

ہر آستاں کا تصور فلک نشیمن ہے
نیاز مند جبینوں کی خیر ہو ساقی

عطا ہوئی ہے یہیں سے عدم کو ہر نعمت
ترے کرم کی خزینوں کی خیر ہو ساقی

بڑے پیار سے بات کرتے رہے ہیں
مروّت کی برسات کرتے رہے ہیں

جنہیں تجھ سے رغبت تھی حد سے زیادہ
وہ تیری شکایات کرتے رہے ہیں

حرم میں خیانت تو کوئی نہیں کی
وہاں بھی تری بات کرتے رہے ہیں

ذرا سامنے آئیں تو اُن سے پوچھیں
وہ کِس سے ملاقات کرتے رہے ہیں

انہیں اب نہ تکلیف دو اِعتنا کی
وہ بے حد عنایات کرتے رہے ہیں

خدا تو خدا ہے یہاں آدمی بھی
بڑے ظلم دِن رات کرتے رہے ہیں

ہماری عدمؔ صرف اتنی خطا ہے
خِلافِ روایات کرتے رہے ہیں

اے چاند ستارو، مرے نزدیک نہ آنا

دو دن کی بہارو، مرے نزدیک نہ آنا

گو تم سے جُدا ہو کے میں زندہ نہ رہوں گا

پھر بھی میرے یارو، مرے نزدیک نہ آنا

تم آتے ہو نزدیک تو میں رُک نہیں سکتا

اے بادہ گسارو، میرے نزدیک نہ آنا

شاید میری تکلیف سے آگاہ نہیں تم

اے درد کے مارو، میرے نزدیک نہ آنا

بہتر ہے کہ اب بات عدم تک ہی چلی جائے

جینے کے سہارو، میرے نزدیک نہ آنا

کچھ ایسے کوئی دِل نشیں ہو گیا ہے
کہ غم خانۂ دِل حسیں ہو گیا ہے

پڑی ہے نظر اس کی جس آئینے پر
وہی آئینہ مہ جبیں ہو گیا ہے

نہ معلوم کس بدگمانی سے غنچہ
چٹک کر سخن آفریں ہو گیا ہے

اُسے چھوڑنا ہی پڑا تنگ آکر
جو دیر و حرم میں مکیں ہو گیا ہے

عدمؔ اب تری بات پر پختگی سے
ہر اِک اہلِ دِل کا یقیں ہو گیا ہے

غمِ جاں بخش کو آرام جاں کہنا ہی پڑتا ہے
کسی نامہرباں کو مہرباں کہنا ہی پڑتا ہے

بہارِ زندگی سے غم کا بھی گہرا تعلق ہے
کہ کانٹوں کو بھی جزوِ گلستاں کہنا ہی پڑتا ہے

تغافل ایک طبعی خاصیت ہے رسمِ اُلفت کی
تغافل کو مزاجِ دوستاں کہنا ہی پڑتا ہے

وہ لہراتے ہوئے چلتے ہیں جب صحنِ گلستاں میں
قدِ رعنا کو سروِ بوستاں کہنا ہی پڑتا ہے

جوانی ایک کیفیت ہے قیدِ عمر سے بالا
جو افسردہ نہ ہوں ان کو جواں کہنا ہی پڑتا ہے

بسا اوقات دو چیزوں میں اتنا ربط ہوتا ہے
کہ اک کو دوسری کا ترجماں کہنا ہی پڑتا ہے

عدم ہم حالِ دل کہنے کی رغبت تو نہیں رکھتے
مگر جب رُک نہیں سکتے تو ہاں کہنا ہی پڑتا ہے

ہمیشہ مہ جبینوں سے ملاقاتیں نہیں ہوتیں!
مہینے میں بہت سی چاندنی راتیں نہیں ہوتیں

وہ ہم سے اب بھی ملتے ہیں مگر اس سرد مہری سے
کہ اک تکلیف ہوتی ہے ملاقاتیں نہیں ہوتیں

غریبوں کے جہاں میں وقت بھی رک رک کے چلتا ہے
کبھی صبحیں نہیں ہوتیں کبھی راتیں نہیں ہوتیں

جوانی ایک نادانی ہے، نادانی مسرت ہے
مسرت کے لبوں پر ہوش کی باتیں نہیں ہوتیں

نہ ٹوٹے جام سے ٹکرا کے جن میں کفر توبہ کا
عدمؔ کچھ اور ہوتا ہے وہ برساتیں نہیں ہوتیں

مستی میں اُس حسیں کو خدا کہہ گیا ہوں میں
پھر بھی جو کہہ گیا ہوں بجا کہہ گیا ہوں میں

کچھ تو مرے گناہ کی عظمت پہ غور کر
اپنی خطا کو تیری رضا کہہ گیا ہوں میں

چاہا ہے جب کہ تیری وفا کا ثبوت دوں
اپنے خلوص کو بھی ریا کہہ گیا ہوں میں

یا رب مرے خلوص کی وارفتگی تو دیکھ
کس سادگی سے تجھ کو خدا کہہ گیا ہوں میں

مطرب ترے رباب کا دل تو نہیں دکھا
نغمے کو اعتبارِ نوا کہہ گیا ہوں میں

پھولوں کی آبرو کہیں غیرت سے اٹھ نہ جائے
کلیوں کی سادگی کو حیا کہہ گیا ہوں میں

آیا ہوں بخشنے پہ جب اعزاز اے عدمؔ
ہر راہزن کو راہنما کہہ گیا ہوں میں

اس طرح عہدِ بہار آ کے گزر جاتا ہے
جس طرح رنگ کھلونوں کا اُتر جاتا ہے

کیوں پریشاں ہیں نہ معلوم یہ جینے والے
جس کو جینے کی نہ توفیق ہو مر جاتا ہے

میں نے سمجھا تھا چھلکتے ہی رہیں گے ساغر
مجھ کو معلوم نہ تھا وقت گزر جاتا ہے

پھول دو چار جو چُنتے ہیں چمن میں چُن لے
رنگ کی بات نہ کر، رنگ بکھر جاتا ہے

یوں تو ملتا ہی نہیں گھر سے کسی وقت عدمؔ
شام کے وقت نہ معلوم کدھر جاتا ہے

زاہدِ پارسا سے ڈرتے ہیں
بادہ کش ہیں ریا سے ڈرتے ہیں

جانتے ہیں خلوص کی قیمت
بندگانِ وفا سے ڈرتے ہیں

راہ کی مشکلوں کا خوف نہیں
نیتِ رہنما سے ڈرتے ہیں

اتنا طوفاں سے ہم نہیں ڈرتے
جس قدر ناخدا سے ڈرتے ہیں

پھونک دیتی ہے روشنی دل کی
اکتسابِ ضیا سے ڈرتے ہیں!

کیا سلیقہ ہے آشنائی کا
آشنا آشنا سے ڈرتے ہیں

آشنا ہیں ترِی طبیعت سے
لوگ کچھ التجا سے ڈرتے ہیں

کس قدر باخبر ہیں دیوانے
عقل کی بد دعا سے ڈرتے ہیں

بات تو مختصر سی ہے لیکن
بات کی ابتدا سے ڈرتے ہیں

بدنصیبی کی آخری حد ہے
لوگ اس بیوفا سے ڈرتے ہیں

زندگی کے نیاز مند عدمؔ
زندگی کی ادا سے ڈرتے ہیں

جس شے کی طلب ہے وہ بہم ہو نہ سکے گی
تکلیف کچھ ایسی ہے جو کم ہو نہ سکے گی

خط برق کے گو تیز بھی ہیں شعلہ صفت بھی
پر رمزِ جنوں اس سے رقم ہو نہ سکے گی

کیوں آپ پریشان ہیں ناحق مری خاطر
تکلیف مری آپ سے کم ہو نہ سکے گی

سانے تو وہاں بھی بڑے پُر امن ہیں لیکن
جنّت کبھی دیوارِ صنم ہو نہ سکے گی

جھولی ہے فقیروں کی عدم اتنی کُشادہ
یہ قسمتِ اربابِ کرم ہو نہ سکے گی

بزمِ طرب میں سایۂ غم کو بھی لے چلو
جاتے ہو میکدے کو تو ہم کو بھی لے چلو

بیٹھا ہوں مثلِ نقشِ قدم راہِ زیست میں
گر ہو سکے تو نقشِ قدم کو بھی لے چلو

جاتے ہو میکدے میں تو ایمان و کفر کیا
ڈر ہے تو ساتھ دیر و حرم کو بھی لے چلو

کہتے ہیں اس گلی کی ہوا میں ہے زندگی
یوں ہو تو ساتھ اپنے عدم کو بھی لے چلو

جورِ خلّاق کی تضحیک کا ساماں ہونا
کس قدر مضحکہ انگیز ہے انساں ہونا

بندہ پرور یہ حجابوں کا تکلّف کیا ہے
ہستیِ حُسن کی تکمیل ہے عریاں ہونا

تیری رُسوائی نہ بن جائے کہیں موت مری
آج میرے لئے ہرگز نہ پریشاں ہونا

زیست ہے یا کسی مفلس کا چراغِ خانہ
اس نے سیکھا ہی نہیں کھُل کے فروزاں ہونا

آؤ سو جائیں خزاں آنے سے پہلے اِک رات
کون دیکھے گا بہاروں کا پریشاں ہونا

بعض راتوں کو عدمؔ ہوتا ہے محسوس مجھے
اتنا مشکل بھی نہیں گھر کا بیاباں ہونا

تم پاس رہو گے تو خوشی پاس رہے گی
حالات کی تلخی بھی ہمیں راس رہے گی

گو تیری ملاقات کا امکان نہیں ہے
تاہم ترے ملنے کی ہمیں آس رہے گی

اک چیز تو تو چھین کے لے جائیگا مجھ سے
اک چیز مگر تیری مرے پاس رہے گی

تصویر تو میری ہے مگر اس پہ مسلط
بے ربطیٔ اندیشۂ عکاس رہے گی

اے کاش عدم کوئی ہمیں اتنا بتا دے
کب تک یہ جگر سوزیٔ احساس رہے گی

دِل کی تسکیں کا اہتمام کرو — زُلف والو! اسیرِ دام کرو

میرے دل کی اُداس بستی میں — دو گھڑی کے لئے قیام کرو

تم کو بھی آرزو ہے پینے کی — اپنی آنکھوں کا اِحترام کرو

گُل بھی ہیں، مے بھی ہے مغنی بھی — آؤ آغازِ دورِ جام کرو

بادہ خواروں کو شوقِ سجدہ ہے — فرشِ گل پر ذرا خرام کرو

بات پھر ہم سے پوچھنا پہلے — بدگمانی کو نذرِ جام کرو

آج ہم تو نہیں کسی قابل — آج تم خود کچھ انتظام کرو

کارسازی کے مدعی ہو اگر — ہم غریبوں کا کوئی کام کرو

جب بھی سجدہ کرو خدا کو عدمؔ
اپنے وجدان کو امام کرو

مہ جبینوں سے آشنائی کی
بندگی کی کہ کبریائی کی
شاخِ طوبیٰ پہ سانپ لوٹ گئے
بات تھی آپ کی کلائی کی
لوگ کیوں ہو رہے ہیں دیوانے
اُن کی عادت ہے خود نمائی کی
باز آئے ہم ایسی اُلفت سے
کوئی حد بھی ہے جگ ہنسائی کی
عشق اور برکتیں دو عالم کی
عقل اور زحمتیں خدائی کی
وقت پر وہ بھی دے گئے دھوکا
جن سے اُمید تھی بھلائی کی
حشر کی صبح تک تو جائے گی
اے عدمؔ رات ہے جُدائی کی

یوں جستجوئے یار میں آنکھوں کے بل گئے
ہم کوئے یار سے بھی کچھ آگے نکل گئے

واقف تھے تیری چشمِ تغافل پسند سے
وہ رنگ جو بہار کے سانچے میں ڈھل گئے

اے شمع ان پتنگوں کی تجھ کو کہاں خبر
جو اپنے اشتیاق کی گرمی سے جل گئے

وہ بھی تو زندگی کے ارادوں میں تھی شریک
جو حادثات تیری مروّت سے ٹل گئے

جب بھی وہ مسکرا کے ملے ہم سے اے عدمؔ
دونوں جہان فرطِ رقابت سے جل گئے

زندگی بن سنور کے نکلی ہے
مانگ میں رنگ بھر کے نکلی ہے
بوئے گل ایسے کب نکلتی تھی
رفتہ رفتہ بکھر کے نکلی ہے
صبح محشر کی شکل تو دیکھو
سہمی سہمی سی ڈر کے نکلی ہے
تیرے کوچے سے میری رسوائی
اپنی تکمیل کر کے نکلی ہے
قید ہستی میں تھی نسیم عدم
آخر کار مر کے نکلی ہے

راستے کوچہ جاناں کے حسیں ہوتے ہیں
صاحب ہوش خرابات نشیں ہوتے ہیں

یہ نہیں علم کہاں سامنا اُن سے ہوگا
یہ تو معلوم ہے ہم کو وہ کہیں ہوتے ہیں

تیرے وعدے کی حقیقت تو عیاں ہے لیکن
آہ وہ لوگ جو مجبور یقیں ہوتے ہیں

زخم بھر جائیں تو تکلیف کی شدّت کیسی
درد بڑھ جائیں تو محسوس نہیں ہوتے ہیں

کیوں نہ اِک جھوٹی تسلّی پہ قناعت کریں
لوگ کہتے ہیں عدم خواب حسیں ہوتے ہیں

زندگی رنگ و خد و خال کی دیوار نہیں
آدمی رونقِ بازار ہے بازار نہیں

گو خموشی نہیں ماتوبِ تکلّم پھر بھی
اس سے بہتر کوئی پیرایۂ اظہار نہیں

سوچ لو راہ میں مجھ کو نہ پریشاں کرنا
راستہ زیست کا کہتے ہیں کہ ہموار نہیں!

ایک ہی بار کنارے پہ لگے گی جا کر
ناؤ وہ ناؤ کہ ساحل کی طلب گار نہیں

اس کی تیزی سے دہن جل نہیں سکتا ساقی
جام میں مے ہے ترا شعلۂ رخسار نہیں

چارہ سازوں کی تکالیف کی کوئی حد ہے
مجھ کو محسوس یہ ہوتا ہے میں بیمار نہیں

تیرے اندازِ تغزّل میں وہ بجلی ہے عدمؔ
جو کسی دوسرے محمل میں شرربار نہیں

مجھے بدگمانی نہیں ساز سے
شناسا ہوں میں تیری آواز سے
اگر چھیڑنی ہے کہانی مری
تو پھر چھیڑنا اس کو آغاز سے
فضا اتنی محدود تھی باغ کی
ندامت ہوئی ذوقِ پرواز سے
مغنّی! مری رُوح ویران ہے
اسے پھُونک دے اپنی آواز سے
نہیں دُور ہوتا دلوں کا ملال
مگر تیری آنکھوں کے اعجاز سے
ہم آشفتگانِ ازل کا مزاج
سمجھ لو طبیعت کے انداز سے
نہ جانے قدم میرے وجدان کا
تعلق ہے کس گلشنِ راز سے

سیاہ خانۂ دل ہی سے اک چراغ ملا
بڑی تلاش کے بعد آپ کا سُراغ ملا
لبوں کی جوت میں شبنم کی چاندنی دیکھی
گلوں کی اوٹ میں جلتا ہوا چراغ ملا
تمام رات رہے فرشِ گل پہ آسُودہ
سحر کے وقت نہ ساقی ملا نہ باغ ملا
نہ پُوچھ کتنی مسرت ہوئی قیامت کو
ترے مزاج کا تھوڑا سا جب سُراغ ملا
گل و ستارہ و شبنم عبث پریشاں ہیں
غمِ حیات سے کس کو عدمؔ فراغ ملا

نمازوں سے بہتر ہیں دل کی خطائیں
دُعا کیجئے یہ دِیے بجھ نہ جائیں

یہ رحمت کچھ اتنی ضروری نہیں ہے
ذرا سوچ کر وہ ہمیں آزمائیں

ہیں موضوع اِس کے سوا بھی ہزاروں
میرا حال کیوں لوگ اُن کو سُنائیں

خیال آگیا ہے جو اُن گیسوؤں کا
اُمڈتی چلی آرہی ہیں گھٹائیں

کہیں موت اِس آگ میں جل نہ جائے
بہت تلخ ہیں زندگی کی ہوائیں

عدم یہ روش بھی نہایت غلط ہے
نہ وہ لوگ آئیں نہ ہم لوگ جائیں

تِرے وصال کی اُمید کر رہا ہُوں میں
گناہِ شبنم و خورشید کر رہا ہُوں میں

مآل کچھ ہو مِری بے ریا محبّت کا
بڑے خلوص سے تمہید کر رہا ہُوں میں

عجیب کام ہُوا ہے سپُردِ محشر میں
تِری جفاؤں کی تردید کر رہا ہُوں میں

نہ چھیڑ اور مجھے راہبر خدا کے لیئے
یہ ظلم کم ہے کہ تقلید کر رہا ہُوں میں

ہے موت ایک بہانہ عدم سے ملنے کا
تعلّقات کی تجدید کر رہا ہُوں میں

وہ مہ جبیں جو ہمیں شاد کام رکھتے ہیں
مسیح و خضر سے برتر مقام رکھتے ہیں

نہ پوچھ زہرہ جبینوں کے اختیار کی بات
یہ لوگ کون و مکاں زیر دام رکھتے ہیں

شراب جتنی مناسب ہو ڈال دو اس میں
فقیر ایک شکستہ سا جام رکھتے ہیں

یہ دیکھنا ہے کہ کب تک وہ ہم غریبوں کو
اسیر سلسلۂ صبح شام رکھتے ہیں

عدم تلاش ہے اُن پُر خلوص بندوں کی
جو آستینوں میں ہر وقت جام رکھتے ہیں

ہو گئیں سازگار تکلیفیں!
بن گئیں غم گسار تکلیفیں!
سینکڑوں راحتوں سے بہتر ہیں
ایک دو خوشگوار تکلیفیں!
موت اور صرف نزع کی تکلیف
زندگی اور ہزار تکلیفیں!
اتنی تکلیف دو نہ یاروں کو
سہہ سکیں گے نہ یار تکلیفیں
ہم کو پہنچائی ہیں زمانے نے
اے عدم بے شمار تکلیفیں

آپ کی انکھڑیوں میں رنگ نہیں
میرے دل میں کوئی اُمنگ نہیں

چھیڑیئے تو مچل ہی جائے گی
زندگی ہے خمیرِ سنگ نہیں

دُھل ہی جاتا ہے مے کے چھینٹوں سے
اتنا مُہلک خِرد کا زنگ نہیں

آپ کا دل بہت کشادہ ہے
آپ کی آستین تنگ نہیں!

اے عدمؔ سوچتا ہوں میں اکثر
زندگی موت کی اُمنگ نہیں

ترے حضور بھی دِل بدگماں سا رہتا ہے
نہ جانے کون ہے جو درمیاں سا رہتا ہے
شکستِ دِل کی تمہیں کیا خبر کہ یہ نغمہ
وہ حادثہ ہے جو اکثر نہاں سا رہتا ہے
مجھے گماں تھا کہ بستی اُجاڑ ہے دِل کی
یہاں تو خیر سے اک کارواں سا رہتا ہے
شراب چیز تو اچھی نہیں مگر اس سے
نظامِ عالمِ ہستی رواں سا رہتا ہے
تری گلی نہ سہی، کُنجِ میکدہ ہی سہی
وہاں بھی سِلسلۂ کہکشاں سا رہتا ہے
خدا کرے کوئی بجلی اِدھر نکل آئے
چمن میں ہم کو غمِ آشیاں سا رہتا ہے
کسی حسیں سے لگاؤ علاجِ طبیعت کو
کہ اِس فریب سے دِل کچھ جواں سا رہتا ہے

دِل سے آتی ہے یار کی خُوشبو
گیسوئے مشک بار کی خُوشبو

ہائے وہ اوّلیں ملاپ کا رس
اُف وہ پہلی بہار کی خُوشبو

آ ہی جاتی ہے بادہ خواروں کو
لُطفِ پروردگار کی خُوشبو

یاد یُوں ہے لُٹی جوانی کی
جیسے بوسیدہ ہار کی خُوشبو!

جل نہ جائے عدمؔ حیات مری
دے رہی ہے چنار کی خُوشبو!

اُس شوخ کے شباب کی باتیں نہ چھیڑیئے
گرمی ہے، آفتاب کی باتیں نہ چھیڑیئے

رندانِ تشنہ کام کی حالت خراب ہے
اُمڈے ہوئے سحاب کی باتیں نہ چھیڑیئے

ساقی کے انتخاب کی باتوں کا کیا جواب
ساقی کے انتخاب کی باتیں نہ چھیڑیئے

باتیں ضرور چھیڑیئے گیسو بکھیر کر
لیکن خیال و خواب کی باتیں نہ چھیڑیئے

گھبرا کے زندگی کے اندھیرے نہ جاگ اُٹھیں
شب ہائے ماہتاب کی باتیں نہ چھیڑیئے

دُنیا کی دانشوں کا اثاثہ نہ جل بجھے
نادانیٔ شباب کی باتیں نہ چھیڑیئے

کیوں ذکرِ حادثات کو کیجے عدمؔ پسند
کیوں شاہد و شراب کی باتیں نہ چھیڑیئے

مَے میں ڈوبے ہوئے جذبات کی بُو آتی ہے
میرے شعروں سے خرابات کی بُو آتی ہے

رہبروں کو مرے رستے سے ہٹا دو یک لخت
ان سے فرسودہ روایات کی بُو آتی ہے

ابرِ اُفق سے ابھی اُٹھا بھی نہیں اے ساقی
یہ کہاں سے مجھے برسات کی بُو آتی ہے

تیری رفتار ہے یا صبحِ ازل کی مستی!
تیری رفتار سے نغمات کی بُو آتی ہے

ساقیا مجھ کو تری ہنستی ہُوئی آنکھوں سے
ایک دیرینہ ملاقات کی بُو آتی ہے

یہ نہیں علم محبت کسے کہتے ہیں عدمؔ
ہاں مگر دل سے کسی بات کی بُو آتی ہے

غمِ محبت ستا رہا ہے، غمِ زمانہ مسل رہا ہے
مگر مِرے دِن گزر رہے ہیں، مگر مرا وقت ٹل رہا ہے

وہ ابر آیا وہ رنگ برسے وہ کیف جاگا وہ جام کھنکے
چمن میں یہ کون آ گیا ہے تمام موسم بدل رہا ہے

مِری جوانی کے گرم لمحوں پہ ڈال دے گیسوؤں کا سایہ
یہ دوپہر کچھ تو معتدل ہو تمام ماحول جل رہا ہے

نہ دیکھ او مہ جبیں مِری سمت اتنی مستی بھری نظر سے
مجھے یہ محسوس ہو رہا ہے شراب کا دَور چل رہا ہے

علامِ خرابات کی سحر ہے کہ بارگاہِ رموزِ ہستی
اِدھر بھی سورج نکل رہا ہے اُدھر بھی سورج نکل رہا ہے

تِرے غم کا جو حاصِل ہو گیا ہے
وہ دِل جینے کے قابل ہو گیا ہے
نہیں پہچانتا کوئی کِسی کو
یہ کیا اندازِ محفِل ہو گیا ہے
بڑھا ہے درد جب اپنی حدوں سے
تو اکثر راحتِ دل ہو گیا ہے
تلاطم کے تھپیڑوں کی مدد سے
سفینہ نزدِ ساحل ہو گیا ہے
عَلم جس کے سہارے جی رہے تھے
وہ شاید ہم سے غافل ہو گیا ہے

دلِ ناداں کو بہلانا پڑا ہے
فریبِ آرزو کھانا پڑا ہے
گناہِ زندگی کرنے کی خاطر
بسا اوقات مرجانا پڑا ہے
بہت ناداں بنتے جا رہے تھے
خردمندوں کو سمجھانا پڑا ہے
بڑے نادم ہیں ہم جاں سے گزر کر
اُنھیں افسوس فرمانا پڑا ہے
تبسم کی سزا کتنی کڑی ہے
گلوں کو کھِل کے مُرجھانا پڑا ہے
عدؔم ہمراہ تھی وہ میکدے تک
یہاں تک ہوش کو آنا پڑا ہے

خدا رکھے کہاں قسمت لڑی ہے
محبت آپ سے کرنی پڑی ہے

کسی سے حال سن لیتے ہو میرا
مری خاطر یہ زحمت بھی بڑی ہے

غمِ ہستی کی میعاد مقرر
ہمیں کچھ مختصر کرنی پڑی ہے

جہاں جہاں اُن سے ہم ملے تھے، حسیں مقامات بن گئے ہیں
کہیں حرم کی بِنا پڑی ہے، کہیں خرابات بن گئے ہیں
مِرے چھلکتے ہوئے سبُو سے، جو چند قطرے اڑے تھے مے کے
وہ موسمِ گُل کی التجا پر، شفق کی برسات بن گئے ہیں
کبھی کبھی تو کسی حسیں کے، دراز اور تابناک گیسو
کچھ اِس طرح مُنتشر ہوئے ہیں، بہار کی رات بن گئے ہیں
کچھ ایسی بے ساختہ ادا سے نقاب اُٹھائی ہے آج اُس نے
کئی حجابات اُٹھ گئے ہیں کئی حجابات بن گئے ہیں
اِدھر بھی بدلی اُدھر بھی بدلی اِدھر بھی سایہ اُدھر بھی سایہ
وہ کاکلیں اِس طرح کُھلی ہیں عجیب حالات بن گئے ہیں
جو چند لمحے علامؔ فقیروں کے پاس بیٹھے ہیں صدقِ دل سے
وہ چند لمحوں کے فیض سے صاحبِ کرامات بن گئے ہیں

پھولوں نے گلستاں سے تعارف کرا دیا
لفظوں نے داستاں سے تعارف کرا دیا

ٹھہرے بس اتنی دیر کی خاطر چمن میں ہم
بجلی کا آشیاں سے تعارف کرا دیا

ملنے دیا نہ اُن سے جنوں نے بہ قیدِ ہوش
گویا کہ درمیاں سے تعارف کرا دیا

ترغیب زیست دے کے کسی مہرباں نے
کس مرگِ ناگہاں سے تعارف کرا دیا

ہم آپ گو رہین مسافت رہے عدم
منزل کا کارواں سے تعارف کرا دیا

دِل ہے مَندر تُم اُس کی مُورت ہو
ہائے تُم کِتنی خُوب صُورت ہو

دُنیا

ناچ ناچ خوب ناچ

اے ذلیلِ بے سوا
زندگی ہے اِک ریا
کیا امیر کیا گدا
سب ہیں تیرے آشنا
ناچ میری مہ لقا
کیا ثبات کیا فنا

سب تِرے غلام ہیں
گردشوں میں جام ہیں

ناچ ناچ خوب ناچ

اے ضمیرِ اہرمن
اے شریعتِ چمن

گُل فروش، گُل بدن
دِلبری ہے تیرا فن
بندگی بھی حُسنِ ظن
اور خُدا بھی اِک جتن
سب حسین جھُوٹ ہیں
رہزنوں کی لوٹ ہیں

ناچ ناچ خُوب ناچ
اَے کنیزِ مصلحت
کیا جواں ہے تیری گت!
یہ پھبن، یہ تمکنت
سورماؤں کی سکت
اتنا زور اتنا ست
اُف یہ رقصِ شش جہت
تھم گئے ہیں کارواں
رُک گئے ہیں آسماں

جیون

جیون اِک کانٹا ہے ساجن

پھولوں کی دیوار نہیں ہے!
گیتوں کی جھنکار نہیں ہے!
مفلس ہے زردار نہیں ہے

جیون ہے اِک سایہ ساجن

جگنو کی قندیل نہیں ہے
شبنم کی تمثیل نہیں ہے
شاعر کی تخئیل نہیں ہے

جیون بوجھ ہے دو ریتوں کا

میت ملیں تو اُڑ سکتے ہیں
ٹوٹے شیشے جُڑ سکتے ہیں
وقت کے دھارے مُڑ سکتے ہیں

پھیری

گھونگٹ میں چاند سا مکھڑا
مکھڑے ہیں نین رسیلے
او ساجن چھیل چھبیلے
انگیا کے بند ہیں ڈھیلے
جوبن کی مدھرا پی لے

کولھے پر جل کی گاگر
شانوں پر بال گھنیرے
کرتی ہوں کتنے پھیرے
اس آس پہ ساجن میرے
پنگھٹ پر کوئی گھیرے

باہوں میں پریم کے جھولے

جھولوں میں رنگ کی نیّا

نیّا کا کون کھویّا

آئے میرے پریم کنہیا

دھر دھا دھا دھیّا دھیّا

ساز

زندگی کے ساز کو دھیرے دھیرے چھیڑیئے
تار ہیں ڈرے ہوئے
درد سے بھرے ہوئے
دم بخود، مرے ہوئے
زخم جب ہرے ہوئے
رنگ کیا بہائے گا
ساز ٹوٹ جائے گا

زندگی کے ساز کو دھیرے دھیرے چھیڑیئے
پھول لے کے آیئے
پریم رس پلایئے
ساز کو منایئے

پھر اسے بجائیے
سازہے کلی نہیں
رنگ کی ڈلی نہیں

زندگی کے ساز کو دھیرے دھیرے چھیڑیئے
تو وُہ تار ہل پڑے
بے دریغ کِھل پڑے
اب سُروں میں دِل پڑے
ضربِ متصل پڑے
رنگ کُھل کے آئے گا
ابر گِھر کے چھائے گا

گائے جا

اے حسین مُطربہ

سادگی سے گائے جا

زمزمے بہائے جا

بجلیاں گرائے جا

پھول کی مہک ہے تو

جام کی کھنک ہے تو

اے حسین مُطربہ

چاندنی ہے رنگ میں

موج ہے اُمنگ میں

تیرے انگ انگ میں!

گیت ہیں رچے ہوئے
شور ہیں مچے ہوئے

اے حسینِ مُطربہ
رُوپ اک پیاس ہے
کانچ کا گلاس ہے
دو دِلوں کی آس ہے

کھیتیاں ہری رہیں
جھولیاں بھری رہیں

مرجائیں

ساون کی گھٹائیں آئیں
سرشار ہوائیں آئیں
سکھیوں نے مرادیں پائیں
ہم کس سے نین ملائیں
مرجائیں

سکھیوں نے ڈالے جھولے
لیکن جیسے اگنی چھوئے
وہ سرسوں کیسے پھولے
ہم کس کو حال سنائیں
مرجائیں

سکھیوں کے طعنے جھیلیں
یا آنکھ مچولی کھیلیں
سُوکھی ہیں من کی بیلیں
کیا جھُوٹی جوت جگائیں
مرجائیں

پڑاؤ

اَے رہروو! ٹھہرو

چھوڑے وطن ہیں ہم

تصویرِ محن ہیں ہم

مشتاقِ سخن ہیں ہم

دُکھ درد مٹا جاؤ

اَے رہروو! ٹھہرو

بچھڑے ہوئے یاروں کا

اُلفت کے ستاروں کا

پھولوں کا، نگاروں کا

کچھ حال سنا جاؤ

تھام

ذرا تھام ساغر کو اے مہ جبینہ
مجھے آ رہا ہے بلا کا پسینہ
ابھی سینکڑوں کام اُدھورے پڑے ہیں
مصائب ہر اک راستے میں کھڑے ہیں
مقاصد کے سینے میں خنجر گڑے ہیں
سِتم زندگی کے بہت ہی کڑے ہیں
یہ طوفان اور برگِ گل کا سفینہ

ذرا تھام ساغر کو اے مہ جبینہ!
مجھے آ رہا ہے بلا کا پسینہ!

مجھے علم ہے لوگ مے پی رہے ہیں
تجلّی سے لبریز شیشے پی رہے ہیں

جنہیں عقل کا پاس ہے پی رہے ہیں
بلا پیش و پس پے بہ پے پی رہے ہیں
مگر مجھ کو آتا نہیں یہ قرینہ

ذرا تھام ساغر کو اے مہ جبینہ
مجھے آ رہا ہے بلا کا پسینہ

جہاں مے کے چھینٹے مسرت فشاں ہیں
اُسی بزم میں اشکِ غم بھی رواں ہیں
یہ کیسے حجابات سے درمیاں ہیں
کئی ہنس رہے ہیں کئی نوحہ خواں ہیں
یہ غفلت ہے یا عافیت سوز کینہ

سُہاگ

رات کتنی مست ہے
شوق کیا جوان ہے
فرشِ گُل ہے زیر پا
سر پر آسمان ہے
ہر نظر ہے اِلتجا
ہر ادا زبان ہے
ابروؤں میں گیت ہیں
انکھڑیوں میں جان ہے
کاش کوئی چھیڑ دے
اِک گرہ اُدھیڑ دے
گیسوؤں کے جال کو
چار سُو بکھیر کر

دیکھتی ہوں راستہ

تین پھیر پھیر کر

کاش لائے چاندنی

کوئی جید گھیر کر

دیکھ دیکھ رے سجن

اب نہ اِتنی دیر کر

آکے مجھ کو بھینچ لے

مرے ہونٹ سینچ لے

دفن ہیں ساغروں میں ہنگامے
کتنی اُجڑی ہوئی بہاروں کے
نام کندہ ہیں آبگینوں پر
کتنے ڈوبے ہوئے ستاروں کے

حشر تک بھی اگر صدائیں دیں
بیت کر وقت پھر نہیں مڑتے
سوچ کر توڑنا انہیں ساقی
ٹوٹ کر جام پھر نہیں جڑتے

اسیرِ سلسلۂ گیسوئے دراز کریں
خرابِ مستیٔ چشمِ فسوں طراز کریں
ادب سے بڑھ کے خدایانِ چشم و گیسو کو
کہو کہ بابِ خرابات جلد باز کریں

زندگی کی دراز پلکوں پر
راستے کا غبار چھایا ہے
آبِ کوثر سے آنکھ کو دھو لے
مے کدہ پھر قریب آیا ہے

ایک ریزہ ترے تبسم کا
اُڑ گیا تھا شراب خانے سے
حوضِ کوثر بنا دیا جس کو
واعظوں نے کسی بہانے سے

حشر کی دھوپ اور یہ جرمِ عظیم
فیصلے میں اگر توقف ہے
داورِ حشر! کہہ فرشتوں سے
ہم کو لا دیں کہیں سے چشمۂ مے

عروسِ صبح نے لی ہے مچل کے انگڑائی
صبا کی نرمئ رفتار ہے سرور انگیز
یہ وقت ہے کہ عبادت کا اہتمام کریں
خلوصِ دل سے اُچھال ایک ساغرِ لبریز

شام ہے اور پار ندی کے
ایک ننھا سا دیے قرار دیا
یوں اندھیرے میں ٹمٹماتا ہے
جیسے کشتی کے ڈوبنے کی صدا

وصل کی شب ہے اور سینے میں
ایک مدہوش آگ کا رس ہے
آج سارے چراغ گُل کر دو
آج اندھیرا بڑا مقدس ہے

رات کو شہر کہکشاں کی طرف
رُوح کرتی ہے کس لئے پرواز
یہ ستارے ہیں یا محبّت کے
گُم شُدہ واقعات کی آواز

کتنی صدیوں سے عظمتِ آدم
عجزِ فطرت پہ مُسکراتی ہے
جب مشیّت کی کوئی پیش نہ جائے
موت کا فیصلہ سُناتی ہے

ذوقِ پرواز اگر رہے غالب
حلقۂ دام ٹوٹ جاتا ہے
زندگی کی گرفت میں آکر
موت کا جام ٹوٹ جاتا ہے

پَر لگا کر اُڑے گا نام ترا
لے فقیرانِ میکدہ کی دُعا
خُوب صُورت مُغنیّہ ہنس کر
شاعروں کو ذرا شراب پلا

شکن نہ ڈال جبیں پر شراب دیتے ہوئے
یہ مُسکراتی ہُوئی چیز مسکرا کے پلا
سُرور چیز کی مقدار پر نہیں موقوف
شراب کم ہے تو ساقی نظر ملا کے پلا

یہ تیرے مُلک کے مقدّس لوگ
کتنے فرخندہ نام ہیں ساقی
کتنی اُلفت ہے اِن کو طاعت سے
کتنے پُختہ غلام ہیں ساقی

مفلسوں کو امیر کہتے ہیں
آبِ سادہ کو شیر کہتے ہیں
اے خدا تیرے باخرد بندے
بُزدلی کو ضمیر کہتے ہیں

زندگی ہے کہ اِک حسین سزا
زیست اپنی ہے غم پرائے ہیں
ہم بھی کِن مفلسوں کی دنیا ہیں
قرض کے سانس لینے آئے ہیں

یہ زندگی ہے کسی میکدے کا ناز نہیں
یہ زلزلہ ہے کسی میکدے کا ساز نہیں
جو نوکِ تیغ پہ ہوتا ہے یہ وہ سجدہ ہے
جو برگِ گُل پہ ادا ہو یہ وُہ نماز نہیں

مایوس ہو گئی ہے دُعا بھی جبین بھی
اُٹھنے لگا ہے دِل سے خُدا کا یقین بھی
تسکیں کی ایک سانس ہمیں بخش دیجئے
یہ آسماں بھی آپ کا اور یہ زمین بھی

ماہ و انجم کے سرد ہونٹوں پر
ہم نشیں تذکرہ ہے صدیوں کا
جام اُٹھا اور دِل کو زندہ رکھ
آسماں مقبرہ ہے صدیوں کا

میں اگر جا سکا نہ منزل تک
عجز سے لوٹ کر نہ آؤں گا
یا بگولوں کا رُوپ لے لُوں گا
یا شعاعوں میں پھیل جاؤں گا

نہ خُدا ہے نہ نا خُدا ساتھی
ناؤ کو آپ ہی چلاتا ہے
یا بغاوت سے پار اُترتا ہے
یا رعُونت سے ڈوب جاتا ہے

جن کو ملّاح چھوڑ جاتے ہیں
اُن سفینوں کو کون کھیتا ہے
پُوچھتی ہے یہ قسمتِ مزدُور
یا خُدا رزق کون دیتا ہے

ناخدا کس لئے پریشاں ہے
کشمکش عین کامیابی ہے
گر کنارہ نہیں مقدّر میں
قعرِ دریا میں کیا خرابی ہے

جا رہا تھا حرم کو میں لیکن
راستے میں بخوبیٔ تقدیر
اک مقامِ ایسا آگیا جس نے
ڈال دی میرے پاؤں میں زنجیر

طلعتِ ماہتاب پیتے ہیں
تابشِ آفتاب پیتے ہیں
تو بھی پی اے مرے ستارہ جبیں
کہ ستارے شراب پیتے ہیں

یہ وہ فضا ہے جہاں فرقِ صبح و شام نہیں
کہ گردشوں میں یہاں زندگی کا جام نہیں
دیارِ پاک میں مت پڑھ کلامِ رُوح افزا
کہ مقبروں میں خطیبوں کا کوئی کام نہیں

اِک شکستہ سے مقبرے کے قریب
اِک حسیں جوئبار بہتی ہے
موت کتنی مداخلت بھی کرے
زندگی بے قرار رہتی ہے

اپنے انفاس کی علاوت سے
بوئے دمساز آ رہی ہے مجھے
رُوح کے بے کراں خلاؤں سے
تیری آواز آ رہی ہے مجھے

میرے دِل کی اُداس وادی میں
غنچہ ہائے بتوں کھلتے ہیں
گلستانوں پہ ہی نہیں موقوف
جنگلوں میں بھی پھول کھلتے ہیں

سو رہی ہے گلوں کے بستر پر
ایک تصویرِ رنگ و نکہت و ناز
جس کے ماتھے کی نرم لہروں پر
چاندنی رات پڑھ رہی ہے نماز

تیرے جھکے ہوئے حسیں گیسو
جب پریشاں دِکھائی دیتے ہیں
رُوح خضر و مسیح کے چشمے
تشنگی سے دُہائی دیتے ہیں

اے خرابات کے خداوند
دستِ الطاف کو کھلا رکھو
جو محبّت سے چل کے آ جائے
اُس کی اُمید کو ہرا رکھو!

ایک شعلہ تو آج روشن کر
ایک بجلی تو آج چمکا دے
آسماں کے مہیب گنبد سے
ایک ساغر تو آج ٹکرا دے

کون ہے جس نے مَے نہیں چکھّی
کون جھوٹی قسم اُٹھاتا ہے
مَے کدے سے جو بچ نکلتا ہے
تیری آنکھوں میں ڈوب جاتا ہے

دِل کی ہستی بکھر گئی ہوتی!
رُوح کے زخم بھر گئے ہوتے
زندگی آپ کی نوازش ہے
ورنہ ہم لوگ مر گئے ہوتے

اِک حرف اِک طویل حکایت سے کم نہیں
اِک بوند ایک بحر کی وسعت سے کم نہیں
نِکلے خلوصِ دِل سے اگر وقتِ نیم شب
اِک آہ اِک صدی کی عبادت سے کم نہیں

کافی وسیع سِلسلۂ اختیار ہے
کافی طویل مدّتِ عہدِ بہار ہے
میں تیرا ساتھ دوں گا جہاں تک تو چل سکے
اے زندگی تو آپ ہی بے اعتبار ہے

زندگی اِک فریبِ پیہم ہے
مسکرا کر فریب کھاتا جا
روشنی قرض لے کے ساقی سے
ہر دراتوں کو جگمگاتا جا

زیست دامن چھڑائے جاتی ہے
موت آنکھیں چُرائے جاتی ہے
تھک کے بیٹھا ہوں اِک دوراہے پر
دوپہر سر پہ آئے جاتی ہے

ظلمتوں کو شراب خانے سے
دھن کی خیرات ہوتی جاتی ہے
ساغروں کے بلند ہونے سے
چاندنی رات ہوتی جاتی ہے

خرابات منزلِ گہِ کہکشاں ہے
وگرنہ ہر اِک چیز ظلمت نِشاں ہے
لبِ ماہ انجم پہ ساقی ازل سے
تیرا ذکر ہے یا مِری داستاں ہے

آخرت کا خیال بھی ساقی
بادۂ وہم کا اَیاغ نہ ہو
اِس لئے بندگی سے ہوں بیزار
خُلد بھی ایک "سبز باغ" نہ ہو

مَوت کا سرد ہاتھ بھی ساقی
مجھ کو خاموش کر نہیں سکتا
ساز کا تار ٹوٹ سکتا ہے
تار کا سوز مر نہیں سکتا

ساحل پہ اک تھکے ہوئے جوگی کی نبض سی
تلقین کر رہی ہے کنارا ہے زندگی
طوفاں ہیں سفینۂ ہستی کو چھوڑ کر
ملاح گا رہا ہے کہ دریا ہے زندگی

سر سبز سر قدوں پہ وقت سحر
میکشی کی بساط گرم کریں
موت کے سنگ دل غلافوں کو
ساغروں کی کھنک سے نرم کریں

اور ارمان اک نکل جاتا
اک کلی ہنس کے اور کھل جاتی
کاش اس تنگ دل زمانے سے
اک حسیں شام اور مل جاتی

گلستانوں میں گھوم لیتا ہوں
بادہ خانوں میں جھوم لیتا ہوں
زندگی جس جگہ بھی ملجائے
اُس کے قدموں کو چوم لیتا ہوں

رُوح کو ایک آہ کا حق ہے
آنکھ کو ایک نِگاہ کا حق ہے
ایک دِل میں بھی لیکے آیا ہوں
مجھ کو بھی اِک گناہ کا حق ہے

ناؤ میری ہے ناخدا کے سپرد
عقل میری ہے رہنما کے سپرد
وہ بگولا ہوں میں عناصر کا
جس کی تقدیر ہے ہوا کے سپرد

تمہارے حُسن کو میری نظر لگی ہے ضرور
کہاں ہو پہلے سے تبدیل ہو گئے ہو ضرور
خدا کرے مری آنکھوں سے نور چھن جائے
نگاہِ شوق میں تحلیل ہو گئے ہو تم

صُورت کے آئینے میں دلِ پائمال دیکھ
اُلفت کی واردات کا حُسنِ مثال دیکھ
جب اس کا نام آئے کسی کی زبان پر
اس وقت غور سے مرے چہرے کا حال دیکھ

اب بھی ستاروں کے نظارے ملتے ہیں
اب بھی شاخوں پہ پھول کھلتے ہیں
تم نے ہم کو بھلا دیا تو کیا
اب بھی راہوں میں چاند ملتے ہیں

چلتے چلتے تمام رستوں سے
مسرت و سرور آ گئے ہیں ہم
اب جبیں سے نقاب الٹ دیجے
شہر سے دور آ گئے ہیں ہم

اے گدا گر خدا کا نام نہ لے
اس سے انساں کا دل نہیں ہلتا
یہ ہے وہ نام جس کی برکت سے
اکثر اوقات کچھ نہیں ملتا

خوئے لیل و نہار دیکھی ہے
تلخیوں کی بہار دیکھی ہے
زندگی کے ذرا سے ساغر میں
گردشِ روزگار دیکھی ہے

مہک نہ ہو تو فضا گل فشاں نہیں ہوتی
کھنک نہ ہو تو طبیعت رواں نہیں ہوتی
بکھیر گیسوئے مشکیں اٹھا سبو ساقی
میں دیکھوں کس طرح دنیا جواں نہیں ہوتی

تازہ دم نکلا ہے کیا تخلیق کے ترکش سے تیر
دیکھنا وہ سامنے سے آ رہی ہے ایک ہیر
مرمریں گردن میں اک تعویذ ہے اس خوف سے
دودھ کے پیالے پہ لب رکھ دے نہ کوئی راہگیر

زلف بر دوش اگر کوئی حسینہ آ جائے
رقص کرتا ہوا ساون کا مہینہ آ جائے
حسن وہ گرم حقیقت ہے الٹ دے جو نقاب
کعبہ و دیر کے ماتھے پہ پسینہ آ جائے

یہ بے جان چیزوں کی پھیکی نمائش
یہ غنچے یہ کلیاں، یہ تارے ہٹا دو
جہاں سے گذرنا ہے اس نہ حسیں کو
وہاں میرے سینے کی دھڑکن بچھا دو

جس طرف سے بھی میں گذرتا ہوں
زیرِ لب لوگ مسکراتے ہیں
مجھ کو لوگوں کے اس رویّہ سے
سو طرح کے خیال آتے ہیں

علاجِ تلخیٔ زہرابِ غم نہیں ملتا
لبوں پہ جان ہے مگر جامِ جم نہیں ملتا
کٹیں گی راہِ محبت کی منزلیں کیسے
مرے قدم سے تمہارا قدم نہیں ملتا

جام اُٹھا اور فضا کو رقصاں کر
خود بخود کوئی رُت نہیں پھرتی
وقت کی تنگ دل صُراحی سے
مَے کی اک بوند بھی نہیں گرتی

اے مرا جام توڑنے والے
میں تجھے بد دُعا نہیں دیتا
میں بھی ہوں ایک سنگدل تاجر
جو ہنر کا صِلہ نہیں دیتا

فرصتِ نغمہ بار بیت گئی!
مہلتِ زر نگار بیت گئی!
مسکرانے لگی تھی ایک کلی!
کہ اَچانک بہار بیت گئی

تیرگی کے گھنے حجابوں میں
دُور کے چاند جھلملاتے ہیں
زندگی کی اُداس راتوں میں
بے وفا دوست یاد آتے ہیں

بحرِ آلام بے کنارا ہے
زیست کی ناؤ بے سہارا ہے
رات اندھیری ہے اور متاعِ اُمید
ایک ٹوٹا ہوا ستارا ہے

اب میری حالتِ غمناک پہ کڑھنا کیسا
کیا ہوا مجھ کو اگر آپ نے ناشاد کیا
حادثہ ہے مگر ایسا تو الم ناک نہیں
یعنی اک دوست نے اک دوست کو برباد کیا

تبسّم ایک تصوّر ہے وہ بھی دھندلا سا
زمانہ گذرا مرے غم کو مسکراتے ہوئے
غمِ حیات و دلِ ناتواں معاذ اللہ
ہے ایک لہر سمندر کا بوجھ اٹھائے ہوئے

غم نے کیا خوب طبیعت مری پہچانی ہے
آج اِک اور ہی تقریب پریشانی ہے
بے ملاقات نظر آتا ہے جینا مشکل
اور ملاقات میں اِک وقفہ طولانی ہے

زیست گو آہ سرد بھرتی ہے
آرزو جاں کنی سے مرتی ہے
مجھ کو جینے کی ہے ذرا سی اُمنگ
موت کیوں اعتراض کرتی ہے

ایسے جیتا ہوں جیسے شیشے کے
ٹوٹے حِصّوں کو جوڑتا ہے کوئی
یا ترستی ہوئی اُمنگ کے ساتھ
خواب ہیں پھول توڑتا ہے کوئی

زِندگی کے حریص ہاتھوں سے
دامنِ یار ابھی نہیں چھُوٹا
دِل کا مندر اُجڑ گیا لیکن
آس کا بُت ابھی نہیں ٹوٹا

گردشِ روزگار سے کہہ دو
گردشِ جام ہو گیا ہے دِل

میرا وعدہ تری نگاہ نہیں
اپنے وعدہ پہ برقرار ہوں میں

ساقی مرے خلوص کی شدّت کو دیکھنا
پھر آگیا ہوں گردشِ دوراں کو ٹالکر

میں راستہ کا بوجھ ہوں میرا نہ کر خیال
تو زِندگی کی لہر ہے لہریں اُٹھاکے چل

لازم ہے میکدے کی شریعت کا احترام
اے دورِ روزگار ذرا لڑکھڑا کے چل

دَیر و حرم نہیں تو خرابات ہی سہی
اے گردشِ زمانہ کہیں تو قیام کر

اے ناخدا سفینے کا اب کوئی غم نہ کر
ہم فرض کر چکے ہیں کہ ساحل نہیں رہا

جاؤ تمہیں نہ میرے نفس کی ہوا لگے
کیا پوچھتے ہو راہروِ کارواں کی بات

دِل کی تالیف اگر نہیں ہوتی
توڑ ہی دیجئے خدا کے لئے

جن کشتیوں کو میرے مقدر کی رو ملی
اُن کشتیوں کو گھاٹ کنارے نہ مل سکے

ادھر آؤ تماشا ہے غضب کا
سفینہ غرقِ طوفاں ہو رہا ہے

شاید بنانے والے کو کچھ اس کا علم ہو
کس نقطۂ نظر سے بنایا گیا ہوں میں

ترے وجود سے انگڑائی لیکے نکلے گا
وہ میکدہ جو ابھی بوتلوں میں بند نہیں

دِل ابھی پوری طرح نہیں ٹوٹا
دوستوں کی مہربانی چاہیئے

دورِ جام و مینا کی تمکنت بجا لیکن
گردشِ زمانہ بھی گردشِ زمانہ ہے

طلوعِ حشر کا بھی کیا یقین ہے پیارے
دراز ہو تو شبِ انتظار ہے پیارے

سفینہ غرق ہے ملّاح نذرِ موجِ دریا ہے
مرے مولا اسے طوفانِ رحمت تو نہیں کہتے

کیا قرار آئے طبیعت کو عدم
دورِ گردوں دورِ پیمانہ نہیں

جب کسی راہرو نے دم توڑا
دو گھڑی جشنِ رہگذار رہا

دلچسپ ہو گئی ہے پریشانیٔ حیات
اے زلفِ عنبریں تری اُلجھن دراز ہو

دیکھئے جاں نکلتی ہے کہ ارمانِ دل کا
زندگی حلق میں اٹکا ہوا اک موتی ہے

ساقیا مے نہیں تو زہر سہی
یہ بھی ہم لوگ عام پیتے ہیں